JOURNAL OF RESEARCH (URDU)

ISSN (Print): 1726-9067, ISSN (Online):1816-3424
Volume No. 39, Issue No.02

TITLE OF THE PAPER

ثروت حسین کے ناول "اندھیرا پگ" میں خواتین کے سماجی مسائل کا تجزیاتی مطالعہ

AUTHOR(S)

*Muhammad Shakeel Pitafi
Professor, Department of Urdu, NCBA&E, Sub Campus, Multan

**Muhammad Idrees
PhD Scholar, Department of Urdu, NCBA&E, Sub Campus, Multan

***Samra Kouser
MPhil Scholar, Department of Urdu, ISP, Multan

CONTACT
shakilpitafi@gmail.com

HISTORY OF THE PAPER

Received on: 19-09-2023
Accepted on: 28-12-2023
Published on: 31-12-2023

DETAIL(S)

Volume No. 39, Issue No. 02, Page No: 90-115
Publisher:
Department of Urdu, Bahauddin Zakariya University
Multan (Pakistan)-60800

LICENSE

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

COPYRIGHT

©The author(s) 2023. ©Journal of Research (Urdu) 2023.
This publication is an open access article.

JOURNAL'S PROFILE

Journal of Research (Urdu) is a bi-annual "Y" category journal approved by Higher Education Commission of Pakistan.
It started in 2001 from Bahauddin Zakariya University, Multan (Pakistan). At that time, it was owned by the Faculty of Languages & Islamic Studies. Later in 2008, Higher Education Commission of Pakistan recognized it as a research journal of Urdu in Category "Z". Since then, it is owned by the Department of Urdu, BZU, Multan. In 2014, it was upgraded and accepted for Category "Y".

CONTACT

Dr. Muhammad Khawar Nawazish
Editor, Journal of Research
Department of Urdu, BZU Multan-60800

MOBILE:
+92 300 9561745

WEBSITE:
https://jorurdu.bzu.edu.pk/website/

EMAIL:
jorurdu@bzu.edu.pk
khawarnawazish@bzu.edu.pk

ADDRESS

Office of the Journal of Research (Urdu), Department of Urdu, Bahauddin Zakariya University, Multan

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 39, Issue No. 2, December 2023

*محمد شکیل پتافی، **محمد ادریس، ***ثمرہ کوثر

ثروت حسین کے ناول "اندھیرا پگ" میں خواتین کے سماجی مسائل کا تجزیاتی مطالعہ

An Analytical Study of Social Problems of Women in Sarwat Khan's Novel "Andhera Pag"

ABSTRACT

In present era, Sarwat Khan, in her novel “Andhera Pag” has expressed her thoughts and emotions about the situation of women in India’s state Raisthan. In this way, she has brightened her name in those Indian women novelists who have a great concern in situation of women not only in their country but also in the other parts of the region. She is fully aware of the critical situation of Rajisthani women. She is eye witness of the real situation of the region. That’s why his feelings and emotions forced her to write such a novel “Andhera pag” is very important novel of this century about the culture, civilization and situation of Rajisthani society. Sarwat Khan is now a well know Indian women writer. This novel was firstly published n 2005 from Mayyar Publication Dehli. Sarwat Khan concern is to highlight the issue of Rajisthani women. She thinks that this issue should be highlighted, discussed and there should be opened a window of light of solution. In this modern era, when it is considered that the situation of women has been developed and now every woman and a girl have an open access to the education and has a freedom of life weather to decide about his future is marriage and education. Sarwat Khan wants to clear in front of the society that, still all the progress and prospective, situation is the same as it was centuries before in our villages for our women. Our media has no access nor NGOs in those village which are very far from the cities. She has presented a real face of our villages where there are still lake of basic facilities, still people are facing very hard realities of life and are unable to change the destiny of their future races. So, this novel is a great effort to highlight the real problems of out women and Sarwat Khan should be appreciated for her progressive thinkings and tireless efforts for the development of system to solve and notice very merciful situation of Rajisthani womens.

KEYWORDS

Rajisthan, Women, Critical Situation

عصر حاضر میں ثروت خان نے اپنے ناول ''اندھیرا پگ'' کی بدولت اردو کی ناول نگار خواتین میں اپنا نام روشن کیا۔ ثروت کا ابتدائی بچپن راجستھان میں گزرا۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں راجستھانی عورت کی زبوں حالی کا پورا پورا احساس ہے اور اسی احساس میں ڈوب کر ہی انہوں نے یہ ناول تحریر کیا ہے۔ ''اندھیرا پگ'' راجستھانی تہذیب و ثقافت اور معاشرے کے موضوع پر لکھا گیا اس صدی کا ایک اہم ترین ناول ہے۔ یہ ناول 2005ء میں پہلی مرتبہ معیار پبلی کیشن دہلی سے شائع ہوا۔ ناول کی مصنفہ ثروت خان اس وقت بھارت کی ایک سب سے زیادہ معروف اور نامور ادیبہ ہیں جنہوں نے ادبی کالم لکھنے سے قلمی تحریک کا آغاز کیا اور بطور محقق و نقاد اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ 2004ء میں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''ذروں کی حرارت'' شائع ہوا اور 2005ء میں ناول ''اندھیرا پگ'' نے ان کو عالمگیر شہرت عطا کی۔ حال ہی میں آپ کا ناول ''کڑوے کریلے'' 2020ء میں شائع ہوا اور دیگر تصانیف میں ''شورش فکر'' جو تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے شائع ہو چکا اُنھوں نے نواب ٹونک کے خاندان میں 23 جنوری 1960 کو راجستھان میں آنکھ کھولی۔ تعلیم و تدریس سے وابستہ رہیں ہیں خواتین کے مسائل پر گہری نظر رکھتی ہیں اور اسی وجہ سے ان کو اردو ادب کی جدید خواتین لکھاریوں میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے اور ان کی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

ثروت کے ناول ''اندھیرا پگ'' کا موضوع راجستھان کی سرزمین پر خواتین خصوصاً بیوہ کی زندگی ہے۔ آج کے اس جدید دور میں بھی راجستھان میں خواتین سے صدیوں سے رائج فرسودہ نظام، رواج اور روایات کے ذریعے غیر انسانی سلوک کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ ایک افسوس ناک اور قابل رحم صورتحال ہے اور اس موضوع پر زیادہ سے زیادہ گفتگو کرنے اور سماج کی توجہ مبذول کرانے کی ضرورت ہے۔ مسئلے کی حساسیت نے ناول کے موضوع کے ذریعے وہ توجہ حاصل کی ہے جس کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی تھی تاکہ راجستھان کی خواتین کو آج کے اس جدید دور میں بھی درپیش روایتی رسموں اور رواجوں کی جکڑبندیوں سے آزاد کروایا جاسکے۔ محمد نصیر احمد نے ثروت خان کی اِس تخلیقی کاوش کو سراہتے ہوئے لکھا:

> ''پورا ناول ثروت خان کے ذہنی شعور اور ذہنی بالیدگی کو بیان کرنے میں معاون ہے۔ ساتھ ہی اُن کے تجربات اور مشاہدے کا بھی اِس ناول سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔''(1)

اگرچہ یہ ناول ثروت خان کا پہلا ناول ہے لیکن یہ ان کی پہلی تخلیقی کاوش نہیں کیوں کہ ثروت خان ایک عرصہ سے افسانے اور تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھ رہی ہیں لیکن اس ناول نے ثروت خان کو نسائی حقوق کی علمبردار نامور خواتین کی صف میں کھڑا کر دیا ہے اور یہ سب اس موضوع کی حساسیت کی وجہ سے ہے۔

ناول کا پلاٹ راجستھان کے ایک گاؤں دیش نوک کی فرسودہ روایات، رسم و رواج اور حویلیوں میں قید زندگی کی قابل رحم صورتحال پر تشکیل دیا گیا ہے۔ان شاندار حویلیوں کی شان و شوکت جو باہر سے نظر آتی ہے اندر سے اس کی صورتحال انتہائی خوفناک اور اندوہناک حقائق پر مبنی ہے۔ناول کا پلاٹ ایسی ہی ایک حویلی کی حقیقی منظر کشی پر تشکیل دیا گیا ہے۔ ثروت خان نے ناول کے پلاٹ کو کمال مہارت سے اختصار اور جامعیت سے مزین کیا ہے۔ بے جا طوالت، غیر ضروری باتوں، لڑائی جھگڑوں اور غیر متعلقہ چھوٹے چھوٹے حصوں اور کہانیوں سے اجتناب برتا گیا ہے 140 صفحات اور 13 مختصر اور جامع حصوں پر مشتمل ہے۔ ناول کا پلاٹ مربوط اور منظم واقعات سے جڑ کر تکمیل پاتا ہے۔ غیر ضروری طوالت سے گریز کی وجہ سے کہانی میں کوئی بھی جھول نہیں اور ناول کے مطالعہ کے دوران ناول نگار کا مرکزی نقطہ نظر مسلسل ذہن پر گردش کرتا رہتا ہے جس کی وجہ سے قاری کی پوری توجہ، انہماک اور دلچسپی کہانی کی طرف رہتی ہے۔

ثروت خان نے اپنے اسلوب کی مہارت سے قاری کے دل میں راجستھانی خواتین سے ہمدردی کا جذبہ پیدا کرنے کا ہنر استعمال کیا ہے۔ ناول کے پلاٹ کا ہر حصہ ایک ہی کہانی کی نئی Episode کی مانند ہے۔ ثروت خان نے ناول میں راجستھانی تہذیب و ثقافت کو نہایت مہارت سے اور دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے راجستھانی تہذیب و ثقافت کے نہ صرف منفی پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے بلکہ صدیوں سے قائم عظیم روایات، رسم و رواج، اور تہذیب و ثقافت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ناول میں تخلیق کار کی فنی مہارت نے موضوع، پلاٹ، کردار غرض ہر پہلو کو نہایت جاندار انداز میں پیش کیا ہے۔ ناول کی فنی خوبیوں کے متعلق شہاب ظفر اعظمی لکھتے ہیں:

> ”ثروت خان نے اپنے ناول میں موضوع فکر اور تکنیک کے ساتھ اسلوب و اظہار پر بھی قدرت کے ذریعے فنکارانہ ہنر مندی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ناول پہلے صفحہ سے ہی قاری کو اپنی گرفت میں لینے کی قوت رکھتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے فقرے، جامع اور مختصر جملے،

استعاروں اور تمثیلوں میں لپٹے مکالمے بہت کم لفظوں میں بہت زیادہ کہہ کر قاری کو بیک وقت معنی کی مختلف دنیاؤں کی سیر کراتے ہیں۔"(2)

ثروت خان نے ناول میں خالصتاً راجستھانی لب ولہجہ اور انداز گفتگو اختیار کیا ہے جس سے کہانی کے تاثر میں حقیقت کا عکس نظر آتا ہے بعض اوقات انہوں نے راجستھانی زبان کے الفاظ استعمال کر کے بعض واقعات اور گفتگو کا اصلی مفہوم واضح کرنے کی کوشش کی ہے لیکن جہاں ضروری تھا راجستھانی الفاظ کے ساتھ بریکٹ میں ان کا اردو ترجمہ بھی پیش کر دیا گیا ہے۔ جس سے قاری کی مشکل حل ہو گئی ہے۔ راجستھانی رسموں اور رواجوں کا احوال مختصراً پیش کیا گیا ہے جن کو سمجھنے کے لئے ناول کا راجستھانی تہذیب و ثقافت کی روشنی میں جائزہ لینا ضروری ہے۔ جیسا کہ ناول کا عنوان "اندھیرا پگ" ہے ناول کا آغاز بھی انہی الفاظ سے ہوتا ہے اور قاری کے ذہن میں اس لفظ کے صحیح مفہوم کا تجسس پیدا ہو جاتا ہے۔ ناول کا پہلا باب راجستھانی تہذیب و ثقافت اور مناظر فطرت کی منظر نگاری سے شروع ہوتا ہے۔ مثلاً:

"دور کہیں گیدڑوں کی آوازیں، گلی کے کتوں کا رونا اور بلی کی غراہٹ ۔۔۔۔رات کی تاریک فضا میں ان آوازوں سے حویلی کی پھنگیاں تھر تھرا اٹھتی ہیں۔ فرحت بخش فضا حویلی کے در و دیوار سے سر پھوڑ کر، ڈیوڑھی میں بنی اس کوٹھڑی میں جا کر قید ہو گئی تھی۔"(3)

رات کی تاریکی میں یہ حویلیاں وسیع و عریض رقبہ پر پھیلے جنگلوں اور ریت کے ٹیلوں میں گم ہو جاتی ہیں آس پاس سے جانوروں کی آوازیں فضا کو سحر انگیز بنا دیتی ہیں۔ یہ مناظر پر کشش اور حسین بھی ہوتے ہیں اور خوفناک اور تاریک بھی۔ مجموعی طور پر یہ فضا انسان کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہے۔ مناظر دلکش ہوتے ہیں خصوصاً صبح کی ٹھنڈی ہوا اور شبنم کے قطرے تازگی کا احساس دیتے ہیں لیکن یہ فطرت کے نور سے پُر خطے کے لوگوں کی حال ڈھال اور مزاج اس فضا سے قطعی مختلف ہوتا ہے اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے ثروت خان لکھتی ہیں:

"پانی کی ایک بوند۔۔۔جو اجنبی وشناسا اور تپتی بنجر دھرتی کو صرف اس لیے شاداب کرتی ہے کہ ایسے نمودے کر مخلوطی تہذیب کی تشکیل کر سکے۔۔۔یہ کائنات اور اس کا نظام۔۔۔یہ پانی۔۔۔یہ ہوا۔۔۔یہ سورج۔۔۔یہ آسمان۔۔۔سب بے حد منظم۔۔۔

لیکن اس کا محور۔۔۔اس کا مرکز۔۔۔یہ انسان۔۔۔۔نہ جانے کیوں۔۔۔ برہم برہم سا۔۔۔ہمیشہ ہما ہمی پر ہی کیوں آمادہ رہتا ہے۔!!!نہ جانے کیوں۔۔۔کیوں۔۔۔کیوں ۔۔ں۔۔ں؟"(4)

راجستھانی تہذیب و ثقافت کی ایک جھلک پیش کرنے کے بعد ناول نگار نے راجستھان میں بسنے والے انسان کی ذہنی صورتحال جو بالکل متضاد صورت کا منظر پیش کرتی ہے کی طرف توجہ دلاتی ہے۔اس کے بعد ناول نگار نے اگلی سطروں سے دیش نوک کی اس حویلی میں بسنے والی دو خواتین کرداروں کے باہمی پیار محبت ترقی پسندی اور آگے بڑھنے کے جذبہ کی منظر نگاری کی ہے۔روپ کنور سکول میں نہ صرف امتحان بلکہ ڈانس کے مقابلے میں بھی اول آئی ہے اور اس کی اس خوشی اور کامیابی پر اسکی بوا سا یعنی پھوپھی راج کنور خوشی سے نہال ہو جاتی ہے۔

ثروت خان کا کمال یہ ہے کہ وہ کہانی کے ہر موڑ پر راجستھانی تہذیب و ثقافت کو نمایاں کرنا نہیں بھولتی ہیں۔یہ اقتباس اس بات کی عمدہ مثال ہے:

"بھٹی بھائی سا!آپ نے تو کمال کی بچی پیدا کی ہے۔کہتے کہتے انہوں نے بھتیجی کو گلے لگا لیا۔ اس کی پیشانی چومی اور اپنے گلے سے سونے کی بھاری چین اتار کر بھتیجی کے گلے میں ڈال دی۔۔۔یہ کیا بوا۔سونا وونا مجھے نہیں چاہیے۔۔۔۔پارٹی لوں گی۔۔پارٹی۔آپ کے شہر کے میک ڈونل کا پیزا اور کولڈ ڈرنک کی چسکیاں۔واو۔اس نے چٹخارہ بھرا۔"(5)

اس اقتباس میں ثروت خان نے نہ صرف راجستھان کی قدیم روایت اور تہذیب کی نشانی سونے کی مالا یا ہار جو کہ راجستھانی خواتین پہنتی ہیں کا تعارف کروایا ہے بلکہ ساتھ ہی اس رواج کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ کس طرح خواص موقعوں پر نوجوان لڑکیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے اپنے گلے کے زیور اتار کر ان کے گلے میں ڈال کر محبت اور خوشی کا اظہار کرتی ہیں۔اس ہنسی مذاق اور ناز نخروں میں ہی راج کنور اپنی بھتیجی کو اپنے ساتھ شہر لے جانے کا فیصلہ کر لیتی ہے اور اپنے بھائی رتن سنگھ سے اجازت مانگتی ہے کہ روپ کنور کو اس کے ساتھ شہر بھیج دیا جائے تاکہ اس کو شہر کے کسی اچھے کالج میں اعلیٰ تعلیم دلوائی جا سکے۔رتن سنگھ صاف انکار کرتے ہوئے اپنی مجبوریوں کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"راج آخر تم سمجھتی کیوں نہیں۔ ہمیں یہ سب کرنا پڑے گا۔ ورنہ برادری سے باہر کر دیئے جائیں گے۔ ہمارے پیشہ پر آنچ آئے گی۔ ججمانوں کو کیا منہ دکھائیں گے۔ اس کی پڑھائی کو لے کر پہلے سے ہی قصبہ کے لوگوں کا ورودھ جھیل رہے ہیں۔ لوگ مذاق بنانے لگے ہیں کہ "اب اس حویلی کی لگائیاں پنڈت بنیں گی" اور تم آگے پڑھوانے کی بات کرتی ہے۔ تمہیں معلوم ہے اس بات پر پنچائیت تک بیٹھ سکتی ہے۔"(6)

رتن سنگھ بیٹی کو بہن کے ساتھ شہر جا کر مزید تعلیم حاصل کرنے سے انکار کر دیتے ہیں راج کنور بے بسی محسوس کرتے ہوئے خاموشی اختیار کر لیتی ہے لیکن روپ کنور کو جیسے آخری امید بھی ٹوٹتے ہوئے محسوس ہوتی ہے اور وہ اپنے باپ کے سامنے جرات کے ساتھ کھڑی ہو کر سوال پوچھتی ہے:

"میں پوچھتی ہوں باپو، آخر کب تک ہم اس سسٹم کی بھینٹ چڑھتے رہیں گے۔ یہ تو کمیونسٹوں سے بھی بدتر ہے۔ ذہن، مشن، وژن سب کا ناش کرنے والا۔"(7)

اس اقتباس میں روپ کنور کا سماجی شعور اور جرات کھل کر سامنے آتی ہے لیکن رتن سنگھ پورنے تحمل سے بیٹی کو مجبوریاں بتاتے ہوئے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ سسٹم اتنی آسانی سے نہیں بدلا کرتا بلکہ اس کے لیے کئی سال درکار ہوتے ہیں۔ روپ کنور کے سارے جتن ناکام ثابت ہوتے ہیں اور روپ کنور کی والدہ اسے سختی سے خاموش کروا دیتی ہے اسی کے ساتھ ہی پہلے باب کا اختتام ہو جاتا ہے۔

دوسرے باب کا آغاز روپ کنور کی آہوں اور سسکیوں کے ساتھ ہوتا ہے اگلی سطروں میں ناول نگار نے دیش نوک کی وجہ شہرت تہذیب و ثقافت اور تمدن کی چیدہ چیدہ خصوصیات کا حوالہ دیا ہے یہ گاؤں بیکانیر سے پچاس کلومیٹر دور ہے اور کرنی داتا کے مندر کی وجہ سے دنیا بھر سے سیاح اور عبادت گزار ہندو اس مندر میں پوجا پاٹ کے لیے آتے رہتے ہیں یہ سلسلہ سال بھر جاری رہتا ہے اور اس سے نہ صرف یہ کہ اس گاؤں کو خاص شہرت حاصل ہو گئی ہے بلکہ اس گاؤں کے لوگوں کو ذریعہ معاش بھی دستیاب ہوا ہے مندر کے آس پاس گاؤں کے لوگ روایتی راجستھانی ثقافتی لباس، برتن اور کھلونوں کے سٹال لگاتے ہیں۔ مٹھائیاں تیار کرتے ہیں راجستھانی خواتین کے ہاتھ

سے بنے ہوئے خوبصورت دستکاری اور کشیدہ کاری کے اعلیٰ نمونے دنیا بھر کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ناول نگار کے الفاظ میں:

> ''کرنی ماتا کا یہی مندر قصبہ کے باشندوں کی معاشی حالت کو سنبھالے ہوئے ہے۔دور دور سے معتقد اس کے درشن کو آتے ہیں۔season میں کچھ آمدنی ہو جاتی ہے۔ ورنہ ریگستانی علاقہ ہونے کے سبب زرخیزی کہاں ہوتی ہے یہاں کے لوگ کم ہی جانتے ہیں کیونکہ بارش بھی بھگوان بھروسے ہی ہے۔شہر سے کوئی موٹر گاڑی بھی نہیں آتی۔ پکی سڑک جو نہیں ہے۔لوگ اونٹ گاڑیوں سے کام چلاتے ہیں۔لے دے کے ایک تالاب ہے۔بارش ہوتی ہے تو فوراً تالاب بھر جاتا ہے۔ورنہ سالوں سال سوکھا پڑا رہتا ہے۔اس سال بھی یہ بھر گیا تھا۔''(8)

ناول نگار کے اس اقتباس سے اس گاؤں کے لوگوں کی کٹھن اور مشکلات سے بھرپور زندگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔بعض اوقات لوگ سالوں تک بارش کو ترستے ہیں بارش نہ برسنے سے سبزہ نہیں اگتا اور پانی کے لیے بھی لوگوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

خواتین کو دور دراز سے پینے کا پانی بھر کر لانا پڑتا ہے اتنی مشکل زندگی میں اس علاقے میں جب بارش ہو جائے تو اہل علاقہ خصوصاً بچوں اور خواتین کی خوشی دیدنی ہوتی ہے۔بارش کی منظر نگاری کرتے ہوئے ثروت خان نے بزرگوں سے لے کر بچوں تک سب کی خوشی کی حقیقی تصویر کھینچی ہے۔بارش کی خوشی اہل علاقہ کے لیے ہولی، دیوالی یا عید کا سماں باندھ دیتی ہے۔بچوں کو سکول سے چھٹی ہو جاتی ہے۔مائیں مال پوے بناتی ہیں۔بچے کیچڑ میں موج مستیاں کرتے ہیں اور درخت تک جھوم اٹھتے ہیں خواتین خصوصاً نوجوان لڑکیاں چپکے سے حویلیوں اور جھونپڑیوں سے نکل کر چور راستوں سے گزر کر گاؤں کے مردوں اور بزرگوں سے آنکھ بچاتے ہوئے تالاب تک پہنچتی ہیں اور پانی میں اپنا چہرہ دیکھ کر حظ اٹھاتی ہیں اور کرنی ماتا کے مندر میں جا کر چوہوں کو دودھ پلا کر کرنی ماتا کا شکریہ ادا کرتی ہیں اور نذرانہ پیش کرتی ہیں۔ملاحظہ کریں ناول کا یہ اقتباس:

> ''کیا یہ دن بیٹھنے کا ہے،ماں سے آگیا لے کر بڑی مشکل سے آئی ہوں۔معلوم تھا جی جاسا شہر گئے ہوئے ہیں۔چل برگد تک چلیں سنا ہے وہاں جھولے پڑ گئے ہیں۔''(9)

سہیلیاں اکٹھے ہو کر برگد کے درخت کے نیچے جھولے جھولتی ہیں پانی میں اچھل کود کر کے اپنے بچپن کو یاد کرتی ہیں اور گیت گاتی ہیں۔ روپ کنور بھی اپنی سہیلی رقیا کے ساتھ موسم کا لطف اٹھانے کے لیے نکل پڑتی ہے اور تالاب کی طرف جاتے ہوئے اس کو پہچان کر سکھی رام اس کو آواز لگا کر گرم گرم جلیبیاں ساتھ لے جانے کا کہتا ہے۔ سکھی رام ایک بزرگ آدمی ہے جو اس کا خاندانی حلوائی ہے۔ گاؤں کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اس موسم میں رسموں رواجوں کے قید خانے کی اوٹ سے بڑی احتیاط اور مشکل سے ایک دوسرے سے آنکھ ملاتے اور ڈرتے ڈرتے اشاروں کنایوں میں اپنے دل کی باتیں سناتے ہیں اور پھر سماج کی جکڑ بندیوں اور سخت سزاؤں سے ڈرتے ہوئے دل میں مچلنے والی خواہشوں کو دباتے نظر آتے ہیں۔

> ''راجکمار نے روپی کو غور سے دیکھا۔ جھولے پر بھی نظر گئی۔ وہاں سے برگد کی شاخوں پر اسے وہ گھنی ڈھلی ڈھلی شاخیں اچھی لگیں۔ حیرت بھی ہوئی کہ یہ اتنی جلدی کیسے بڑھ گئیں۔ اس نے روپ کنور سے نظریں جما کر جلدی سے گھبراتے ہوئے ہٹا لیں جو اپنی دھن میں نغمہ سرائی کیے جا رہی تھی اور چکی پر چکی بڑھائے جا رہی تھی۔''(10)

اس باب روپ کنور کی سہیلی رقیا کا تعارف ہوتا ہے۔ روپ کنور کے محبوب راج کمار کا بھی جس کے دوستوں میں بھیا، رانا، راکا اور ہنسا شامل ہیں یہ سب گاؤں کے سب سے کم تر اور پسے ہوئے طبقے کے نوجوان ہیں جو مسلسل جدوجہد کر کے زندگی کا سامان کرتے نظر آتے ہیں۔ البتہ اپنے سب دوستوں میں راجو یعنی راج کمار کا دو منزلہ مکان ہے لیکن پھر بھی وہ پروہتوں کی شاندار حویلیوں کی شان و شوکت سے مرعوب ہوتا اور حسد اور نفرت کا اظہار کرتا نظر آتا ہے۔ وہ روپ کنور سے خود کا موازنہ کرتے ہوئے خود کو کم تر محسوس کرتا لیکن اس کے دوست اسے سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اندر ہی اندر راجکمار روپ کنور کی محبت میں یکطرفہ جل رہا تھا۔ اور سوچتا تھا کہ اگر روپ کنور سے کبھی آنکھیں چار ہوئی ہوتیں تو تب ہی اس کو میری حالت کا احساس ہوتا۔

ناول کے تیسرے باب سے لے کر آٹھویں باب تک کا حصہ ناول کے پلاٹ کا وہ حصہ ہے جس میں راجستھان کی تہذیب و روایات اور رسم و رواج کے تاریک پہلوؤں، سماجی پس ماندگی، توہم پرستی، پس ماندہ، ذہنیت، خواتین سے بہیمانہ خاص طور پر بیوہ خواتین سے انسانیت سوز اور ٹی وی اور میڈیا پر دکھائی جانے والی راجستھان کی ترقی

یافتہ اور مہذب زندگی کا پردہ چاک کرتے ہوئے ثروت خان نے پردوں میں چھپی ہوئی راجستھان کی ابتر ترین صورتحال کو گہرے دکھ اور قرب کے ساتھ پیش کیا ہے۔ راجستھان کی اس پس ماندگی اور اندوہناک صورتحال کا دکھ ناول نگار کا ذاتی دکھ بن کر سامنے آتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ثروت خان خود ایک عورت ہیں اور اس جدید دور میں بھی راجستھانی عورت کے دکھ کو سمجھتی ہیں۔ صورتحال کا ذکر کرتے اس قرب کا احساس ہوتا ہے جس سے دوچار ہو کر انہوں نے اس نازک صورتحال اور اہم موضوع پر قلم اُٹھایا۔

ناول نگار کے الفاظ قاری کے ذہن کو راجستھان کی اس الم ناک صورتحال پر ورطہ حیرت میں ڈال دیتے ہیں جہاں سے کچھ ہی دور بھارت کے دارالحکومت دہلی میں خواتین جہیز لینے پوری شخصی آزادی کے ساتھ اپنی مرضی کی زندگی جینے اور خوابوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں آزاد ہیں۔

> ''لڑکیوں کی تعلیم کا رواج تو بالکل نہیں تھا۔ ہاں پروہتوں نے اپنے وراثتی علم یعنی تنتر منتر، کریا کرم کانڈ کو فروغ دے رکھا تھا۔ جو نسل در نسل چلا آرہا تھا۔ گھرانے کے مرد جہاں سنسکرت وید پران کے پنڈت تھے وہیں عورتیں ان پڑھ تھیں۔ حویلی کی اونچی دیواروں میں قید، جہالت کی لعنت سے لپٹی ہوئی نسائیت کے پاس کی چادر بننے کے سوا دوسرا کوئی چارہ نہ تھا نچلہ طبقہ محنت مزدوری کیا کرتا تھا مندر آنے جانے والے سیاحوں کی تعلیم اور طرز زندگی سے یہ لوگ متاثر ضرور ہوتے تھے لیکن موکش کی راہ اتنی آسان نہیں ہوا کرتی۔''(11)

بعض اوقات حکومتی کاغذوں میں اعداد و شمار اور کوائف کسی علاقے کی جو صورتحال پیش کر رہے ہوتے ہیں حقائق اس کے بالکل برعکس ہوتے ہیں یہی صورتحال گاؤں دیش نوک کو بھی درپیش تھی۔

گاؤں کے لڑکے میٹرک تک بہت مشکل تعلیم حاصل کر پاتے تھے لڑکیوں کی تعلیم کا رواج تک نہ تھا گاؤں کے لڑکوں اور لڑکیوں کے پرائمری سکول ویران تھے ایک عدد روم پر مشتمل ڈسپنسری برائے نام قائم تھی دوائیں برائے نام تھیں اور لوگ علاج معالجہ کے لیے جادو ٹونہ وغیرہ پر انحصار کرنے پر مجبور تھے۔ اور اگر زندگی بچ جائے تو دیوی کی کرپا اور مر جائے تو بھاگیا کا لکھا سمجھ کر صبر کرتے تھے۔ بھیرو جو کہ راج کمار کا دوست تھا اس کے ساتھ یہی واقعہ پیش آچکا تھا۔ گاؤں میں علاج کی سہولت میسر نہ ہونے کے سبب پروہت باپ بیٹا بشن سنگھ اور رتن سنگھ

کی منت کرنے چلے گئے پرانے نوکر رہ چکے تھے بشن سنگھ نے رتن سنگھ کو سفارش کر دی جن کے لکھے رقعہ پر بھیرو کے باپ کو سرپنچ دامودر سہالے کی طرف سے 500 روپے لکھائی پڑھائی کر کے دے دیئے اور رتن سنگھ نے گاڑی بمعہ ڈرائیور فراہم کی لیکن مریضہ کی حالت انتہائی تشویش ناک تھی اور وہ بس سٹاپ تک بیس منٹ کی مسافت بھی طے نہ کر سکی اور جان دے بیٹھی اسی طرح کی صورتحال پورے گاؤں کی تھی طرح طرح کی وبائیں پھیلی ہوئیں تھیں موتیابند جو کہ آنکھوں کی شدید وباہے کہ مریضوں کی تعداد سینکڑوں میں پہنچ چکی تھی نہ صرف یہ کہ صحت اور تعلیم کا مسئلہ خطرناک صورتحال پیش کر رہا تھا بلکہ بجلی، پانی، سڑکوں اور خوراک کے مسائل بھی زندگی کو اذیت ناک بنائے ہوئے تھے۔ حویلیوں کی خواتین شدید عدم تحفظ کا شکار تھیں زنان خانے اور مردان خانے کی تمیز مردوں اور عورتوں میں حد فاصل قائم رکھتی تھی لیکن پھر بھی گھر کی خواتین گھریلو ملازماؤں کی کڑی نگرانی کرتی اور انہیں مکمل لباس زیب تن کرنے اور مردوں کی نظروں سے بچ کر رہنے کی تلقین کرتی تھیں۔

راج کمار اور روپ کمار کی خاندانی حویلی میں بھی اس وقت رونی اور دھونی دو ملازمائیں موجود تھیں۔ نمک حلال تھیں اور وفادار بھی حویلی کے کئی راز بھی ان کے سینے میں دفن تھے اور دونوں بہنیں جڑواں بھی تھیں۔ روپ کنور کا اعلی تعلیم حاصل کرنے کا خواب ابھی تک شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا تھا۔ لیکن وہ اپنی ماں، تائیوں اور دادی کے ساتھ حویلی میں جوانی کی ابتدائی عمر میں قدم رکھ چکی تھی اور اس کا وقت اپنی دادی کے ساتھ پیار و محبت اور ناز نخروں میں گزر رہا تھا۔ حویلی میں ایک کمرہ ایسا تھا جس تک کسی کو جانے کی اجازت نہ تھی اور یہ واحد حویلی نہ تھی جس میں اس طرح کا الگ، چاروں طرف سے بند اور پراسرار کمرہ موجود نہ ہو۔ اس طرح کے کمرے بیواؤں کے لیے بنوائے جاتے تھے۔ اس کمرے میں روپ کی ایک پھوپھی قیام پذیر رہ چکی تھی۔ روپ کنور کو اس کمرے کی طرف جانے کی اجازت نہ تھی لیکن اس کے دل میں اس کمرے اور اس کمرے میں رہنے والی بوڑھی پھوپھی جو اب نظر نہیں آتی تھی کے بارے میں جاننے کے لیے بہت بے تابی پائی جاتی تھی لیکن جب بھی وہ ماں یا دادی سے اس حوالے سے سوال کرتی تو اسے جھڑک کر خاموش کروا دیا جاتا تھا۔ اس کمرے کو "نشارا" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ حویلی میں روپ کنور کے والد کے دو بھائی اور بھی قیام پذیر تھے دادا بشن سنگھ بوڑھے ہو چکے تھے اور ان کی گدی روپ کنور کے والد سنبھال رہے تھے جدی پشتی کام جو یہ پرویت صدیوں سے کرتے آرہے تھے وہ نئی نسل کو منتقل کیا جا رہا تھا یعنی کہ کریا کرم وغیرہ۔

البتہ موہکے کے نوجوانوں میں سے انوپ اور مہندرا اسکول میں جب کہ بھائی پریم سنگھ میڈیکل کالج میں شہر میں تعلیم حاصل کر رہا تھا البتہ پرتاب سنگھ پڑھائی چھوڑ کر اپنے تایا سے کریا کرم سیکھتا اور کرنی ماتا کے مندر میں پوجا ارچنا کرتا تھا۔ روپ کنور اب بھی ڈاکٹر بننے کے خواب دیکھ رہی تھی اور کبھی کبھی مندر میں جا کر دعا مانگتی تھی کہ:

''دیوی ماں۔۔۔ میں بھی تمہاری طرح لوگوں کے دکھ درد دور کرنا چاہتی ہوں کچھ کر دکھانا چاہتی ہوں۔ مجھے شکتی دو ماں۔ شکتی دو۔''(12)

روپ کنور کرنی ماتا کے دربار میں منتیں دعائیں مانگتی گاؤں والوں کی بیماریوں اور مصیبتوں کو دور کرنے کے لئے ڈاکٹر بننے کا پکا تہیہ کر چکی تھی لیکن اس کے خواب اور ارمان اس وقت ادھورے رہ گئے جب اچانک اس کی شادی کر دی گئی۔ روپ کنور کو خاندانی رسموں رواج اور روایات کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ لیکن اس کی قسمت میں شاید طویل اندھیری رات لکھی تھی کیوں کہ شادی کے کچھ ہی ہفتوں بعد اس کا شوہر وفات پا گیا اور وہ بیوہ ہو گئی اسی موڑ پر کہانی ایک اذیت ناک رخ اختیار کر لیتی ہے اور انتہائی کم عمری میں ہی روپ کنور کو ان اذیت ناک رسموں تلے روند دیا گیا جو راجستھان کی عورت صدیوں سے روند رہی تھی اور جن کی تفصیل انسانیت کو شرما دیتی ہے۔ اس کے والدین اس کو واپس لانے کے لیے شدید ذہنی اضطراب اور اذیت ناک مراحل سے گزرتے ہیں اور اس عمل کو ان کو تقریباً ڈیڑھ ماہ تک اماوس کی رات اور اندھیرا پگ کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ لیکن قاری اس قدر شدید صدمے سے دوچار ہو جاتا ہے جب اس کے والدین اس کو واپس اپنے گھر لانے کے بعد فوراً روایات اور پرانی فرسودہ رسموں کے قیدی بن کر برسوں سے بند حویلی کے ایک طرف بیوہ کے لیے بنے ''نشاڑا'' میں رہنے پر مجبور کر دیتے ہیں دادی، والد غرض سب کی ساری ہمدردیاں اور محبت ہوا ہو جاتی ہے اور اسے اسی بند کمرے میں قید کر دیا جاتا ہے جہاں برسوں پہلے اس کی بوڑھی پھوپھی رہ رہی تھیں۔

روپ کنور کے دل میں بہت سے سوال تھے اور اس کی ماں نے جب رات کو چپکے سے اس کے کمرے میں جا کر اس کی تسلی کے لیے اس کے بال سہلائے تو وہ سوال پر سوال کر رہی تھی:

''ماں یہ سنسار میرا کیوں نہیں ہے؟ مجھے یہ سنسار دے دو ماں۔۔۔ مجھے سلاو مت ماں! مجھے جگاؤ۔ تم سمجھتی کیوں نہیں ماں۔۔۔ میں اس برہمانڈ کی دھرتی ہوں۔۔۔ مجھے نئے سرے

سے یہ سنسار رچنا ہے ۔۔۔یہ سنسار میرا ہے ماں۔۔۔سارا کا سارا میرا۔۔۔ سارا۔۔ سار۔۔آ۔۔آ۔"(13)

روپی کے یہ سوالات قاری کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں اور راجستھان کی عورت کے دکھ میں جذباتی طور پر شریک بھی کر دیتے ہیں۔ یہ الم ناک صورت حال اور ٹوٹتے خواب صرف روپ کنور کے ہی نہیں تھے بلکہ اس گاؤں کی بہت سی نوجوان لڑکیاں اسی اذیت ناک صورت حال سے گزر رہیں تھیں اور ماؤں کے پاس ان اندھی رسموں اور رواجوں کو ان پر مسلط کرنے کی کوئی لوجک نہ تھی۔

اگلی صبح جب دادی روپ کنور کی والدہ کو اس کے کمرے سے نکلتے دیکھ لیتی ہے تو ایک عورت کا وہ روپ سامنے آتا ہے جس کا تصور کر کے انسان عورت کی عظمت اور پیار و محبت کی دیوی کا جو تصور رکھتا ہے اس کو شدید گزند پہنچی ہے۔ روپ کنور کی حالت اب گھر میں نوکرانیوں سے بھی بدتر ہو جاتی ہے اور اس سے وہ سارے کام کروائے جاتے ہیں جو اس سے پہلے گھر کی نوکرانیاں کرتی چلی آرہی تھیں۔ اس کے شعور کی رو پر وجے سنگھ (اس کا مرحوم شوہر) اور بچپن کی حسین یادیں اور گھر کے بزرگوں، والدین اور بھائیوں کا لاڈ پیار حاوی ہو جاتا اور کئی گھنٹے اسی کیفیت میں گزر جاتے۔ اسے اپنے بچپن کے کمرے تک جانے سے روک دیا جاتا کیوں کہ اس پر اب چچازاد بھائیوں کا قبضہ تھا۔ اس کے ودھوا ہونے کی خبر پورے گاؤں میں پھیل چکی تھی اور راج کمار کو یہ خبر ملی تو وہ بھی فکر مند ہو گیا۔ چار و ناچار روپ کنور کی والدہ نے راج کنور کو ایک خط لکھ کر روپ کنور کی ساری کہانی سے آگاہ کیا اور راج کنور بغیر وقت ضائع کیے روپ کنور کو اس قید خانے سے آزاد کروانے کے لیے فوراً شہر سے حویلی پہنچی۔ ناول کے نویں باب سے ناول کے پلاٹ کا وہ حصہ شروع ہوتا ہے جس میں ناول نگار نے عورت جو راجستھانی روایات سے بغاوت کر کے موت سے بدتر زندگی سے نجات پا کر اپنے خواب پورے کرتے اور خواتین کی زندگی میں امید کی روشنی بکھیرنے کی نوید سنائی اور راستہ دیکھایا ہے۔ راج کنور جو اپنی بھاوج کا خط پڑھ کر روپ کنور کی مدد کے لیے شہر سے اڑتی اڑتی حویلی واپس آئی تھی نے اگلی رات حویلی کے سارے بڑوں کو روپ کنور کے مستقبل کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا اور آخر کار خود آخری فیصلہ سنایا۔

"روپی کل سویرے میرے ساتھ شہر جا رہی ہے بس چپ چاپ ہم نکل جائیں گے۔ وہاں اس کی پڑھائی دوبارہ شروع کروادی جائے گی۔ لوگ پوچھیں گے تو کہہ دینا کچھ ایسی بیماری لگ گئی تھی کہ علاج شہر میں ہوتا۔ اس لیے بوا کے ہمراہ شہر بھیج دیا گیا۔"(14)

راج کنور جس دیدہ دلیری اور عزم و ہمت سے اپنی بھتیجی کو حویلی کی ہولناک زندگی سے نجات دلاتی ہے اس سے کہانی میں ایک نیا جوش نیا جذبہ اور قاری کو تھوڑا سا سکون اور تسلی محسوس ہوتی ہے۔ راج کنور جیسی خواتین یقیناً راجستھانی خواتین کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ جہاں خواتین دکھ سہتے سہتے اسے اپنی ازلی قسمت سمجھ بیٹھتی ہیں اور جب کوئی عورت اس ظلم و زیادتی اور قید سے نکلنے کی کوشش کرتی ہے تو وہ بجائے اس کا حوصلہ بڑھانے اور ساتھ دینے کے اس کو سزا کا مستحق گردانتی ہیں یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے اور خواتین ناامید ہو کر اس روایتی ظلم و ستم کو اپنا قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کرنے کی عادی ہو چکی ہیں اس کی سب سے بڑی مثال اس ناول میں دادی کا رویہ ہے جب راج کنور روپی کو کالج میں داخلہ دلواتی ہے اور وہ بہترین پوزیشن حاصل کر کے میڈیکل کالج میں نمایاں طلباء میں شامل ہو جاتی ہے اور یہ خبر جب دادی کو دی جاتی ہے تو وہ حیرت و خوشی کے ساتھ یہ الفاظ خود کلامی کے انداز میں ادا کرتی ہے:

"کیا ودھوائیں بھی اتنا سُکھ بھوگ سکتی ہیں۔ کیا انہیں نیا سنسار رچنے کا ادھیکار دیا جا سکتا ہے؟ نہیں کداپی نہیں! ہمارے زمانے میں تو۔۔۔!!! اور پھر وہ پلنگ پر دراز ہوئے آنکھیں بند کر لیتیں۔ کچھ دیر کروٹیں بدلتی پھر ٹھنڈی پڑ جاتیں۔"(15)

دادی کا یہ رویہ، یہ سوچ اور خیالات قدامت پرستی اور فرسودہ رسموں کی ذہن پر مضبوط جکڑ بندیوں کی طرف اشارہ کرتی ہے نہ صرف روپ کی دادی بلکہ دادا بشن سنگھ بھی ایسی ہی صورت حال سے دوچار تھے اور خوف زدہ بھی کہ روپ کنور کی تعلیم کا راز کھل گیا تو سماج میں نہ صرف عزت ختم ہو جائے گی بلکہ خاندانی پیشہ اور سماج میں مقام و مرتبہ کو بھی نقصان پہنچے گا۔

ایک اور مثبت پہلو بھی سامنے آتا ہے جس کے ذریعے سماج کو یہ شعور دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ اگر نوجوانی میں بیوہ ہونے والی خواتین کو ستی کرنے یا سماج سے الگ تھلگ اذیت ناک زندگی گزارنے پر مجبور کرنے کی بجائے ان کی حوصلہ افزائی کر کے اور ان کو خوشگوار زندگی کی طرف لوٹنے کی کوشش کی جائے تو ایسی کوششیں ہر گز

ناکام ثابت ہوتی ہیں۔ روپ کنور شہر میں پہنچ کر اپنی بوا کے گھر میں اپنے بھائی روپ کنور، اور چچیرے بھائیوں انوپ اور مہندر اور پھوپھی زاد بھائیوں اشوک اور روی کے ساتھ سازگار تعلیمی ماحول میں اپنی صلاحیتوں کے ہنر دیکھاتی نظر آتی ہیں روپ کنور کی گفتگو میں اس کا سماجی شعور صاف دیکھا جاسکتا ہے جو اس کی بوا کو بھی خوب متاثر کرتا ہے اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہیں:

"ایک ننھے مرجھائے پودے کو باغباں چاہے تو تروتازہ کر پروان چڑھا سکتا ہے اور چاہے تو وہیں مسل کر اس کے وجود کو ہمیشہ کے لئے مٹا سکتا ہے۔"(16)

ناول کے دسویں باب نے راجستھان کی تہذیب و ثقافت کی چیدہ چیدہ انوکھی باتوں سے قاری کو متعارف کروانے کی سعی کی ہے۔ مردان خانے میں گاؤں کے مردوں کا ایک دوسرے کے دکھ سکھ بانٹنا اور دل کا بوجھ ہلکا کرنا۔ ماضی کی یادوں کو دہرانا اور ماضی میں رہنا بزرگوں کو اچھا لگتا تھا انہیں اپنے ماضی کو یاد کر کے سکون ملتا ہے۔ ساتھ ہی جب باہر سے کوئی گروہ یا شخص گاؤں آکر گاؤں کے لوگوں کو سماجی و سیاسی شعور دینے کی کوشش کرتا تو یہ پروہت سخت مزاحمت کرتے اور اپنے مستقبل کے بارے میں فکر مند ہو جاتے۔

راجستھانی قدیم روایتوں سے واقفیت کرانا ان روایتوں کے الم ناک اور غیر انسانی پہلوؤں کو اجاگر کرنا نہیں بھولتیں ہیں۔ رفیق الدین کے گھرانے کی کہانی ایک مختصر واقعہ کی شکل میں بیان کی ہوئی کہانی کہ کیسے ان کو جیسلمیر سے نکالا گیا اور جیسلمیر کے راجا نے رفیق الدین کی بہن کو گھر کی چار دیواری پھلانگ کر ملنے کی کوشش میں جو مار کھائی اس کا انتقام اس نے نہ صرف اس کی بہن کی موت کی صورت میں لیا بلکہ رفیق الدین کے خاندان کو بھی جیسلمیر سے دربدر کر دیا۔ اسی طرح سکھی رام کی زبانی روپشور سنگھ کی کہانی کہ شادی شدہ خواتین کو بچہ نہ پیدا ہونے کی صورت میں کیسے گاؤں کے سب سے طاقتور شخص جسے سانڈھ کہا جاتا سے ہمبستری کروائی جاتی اور خاتون کا شوہر روئتوں اور رواجوں کی قید میں رہ کر اس قدر مجبور ہو جاتا کہ وہ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتے دیکھتا اور کچھ نہ کر سکتا تھا۔ جہاں مرد کی تکمیل اچھی نسل کے بیٹے کا باپ ہونے پر ہوتی۔ اور اگر لڑکی پیدا ہو جاتی تو اسے جینے کا حق بہت مشکل سے ملتا۔ یہ نوجوان اپنی نوجوانی کے نشے میں درجنوں لاولاد خواتین سے ہمبستری کرتے اور آخر کار Hiv

positiveہو کر مردوں جیسی زندگی کا شکار ہو جاتے۔ان کی اپنی کوئی اولاد نہ ہوتی اور ذاتی زندگی خوفناک منظر پیش کرتی۔

گیارہویں باب میں کہانی میں اچانک ایک ایسا موڑ آتا ہے جس سے قاری ایک نئی حیرت سے دوچار ہو جاتا ہے جب رتن سنگھ اپنی نوکرانی روتی کو دبوچ کر جنسی درندگی کا نشانہ بناڈالتا ہے اور اس کی بیوی سبھدرا موقعہ پر اس کو نوکرانی کے ساتھ اسی حالت میں دیکھ لیتی ہے میاں بیوی کے تعلقات میں خلاء آجاتا ہے اور کئی مہینوں تک تعلقات اور بول چال منقطع ہو جاتا ہے۔ لیکن حالات کی ستم ظریفی یہ کہ روتی حاملہ ہو جاتی ہے رونی کی بہن دھوتی اس نئی مصیبت پر بے بسی کی تصویر بنی نظر آتی ہے اور کچھ کر نہیں سکتی۔ دادی بھی سکتہ میں آجاتی ہے البتہ سبھدرا کو کچھ حیرت نہیں ہوتی کیوں کہ وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی۔ وہ ساس کو تسلی دیتی ہیں اور یہ ٹوکتی ہیں کہ مجھے سب معلوم ہے لیکن ساری بات بتانے سے ڈرتی ہیں بالآخر وہ رتن سنگھ کو ساری بات بتا کر مسئلہ حل کرنے کا فیصلہ کر لیتی ہیں اور جب رتن سنگھ کو ساری بات پتہ چلتی ہے اور ساتھ ہی دادی کو بھی صورتحال سمجھ آتی ہے تو تب روتی کی زندگی سے زیادہ حویلی کی عزت معتبر ٹھہرتی ہے اور سب اس بات پر متفق ہو جاتے ہیں کہ حویلی کی عزت کی خاطر اس کو چپکے سے مار کر گڑھے میں دفن کر دینا چاہیے لیکن سبھدرا حقیقت سے واقف تھی لہذا وہ مزاحمت کرتی نظر آتی ہے لیکن دادی کی روایتی سوچ اور پنڈت رتن سنگھ کا فیصلہ حتمی ثابت ہوتا ہے اور ایک رات خاموشی سے اس کو مار کر لاش حویلی میں دبا دی جاتی ہے۔

سبھدرا سے اور تو کچھ نہیں ہو پاتا البتہ وہ ایک چٹھی لکھ کر راج کنور کو بھجوا دیتی ہے راج کنور خط پڑھ کر شدید صدمے سے دوچار ہو کر فوراً حویلی پہنچتی ہے اور اس صورتحال سے نمٹنے کے طریقے ڈھونڈنے لگتی ہیں لیکن اس وقت ساری صورتحال اس طرح تبدیل ہو جاتی ہے کہ چند دن پہلے روپ کنور کی امتحان میں اعلیٰ کارکردگی کے جشن میں کھانا کھلانے کا کام کرنے والے ایک بہرئے کی دوستی بھیلورانا سے ہوتی ہے وہ اس کی خبر بڑی رازداری سے بھیلورانا کو دیتا ہے لیکن مندر کا ایک پجاری ساری بات سن کر جمجمانوں کو اطلاع کر دیتا ہے کہ پنڈت رتن سنگھ کی بیٹی روپ کنور جو ودھوا ہو گئی تھی وہ شہر میں بڑے مزے کی زندگی جی رہی ہے اور کالج میں پڑھتی ہے۔ جلد ہی یہ خبر پورے گاؤں میں پھیل جاتی ہے اور جس وقت راج کنور سبھدرا سے مل کر حویلی میں رونی کو موت کے نتیجے میں برپا

ہونے والی قیامت کے سد باب کے طریقے تلاش کر رہی ہوتی ہیں عین اسی وقت بوڑھا سکھی رام زنان خانے پہنچ کر اطلاع دیتا ہے کہ روپ کنور کی شہر میں پڑھائی کی خبر کو لے کر مردان خانے میں جمجان اور پنچ آکر رتن سنگھ پر چڑھ دوڑے بشن سنگھ نے سب کو احترام سے بٹھایا اور بات سلجھانے کی کوشش کی کہ روپ کنور کے شوق کو دیکھتے ہوئے میری بیٹی راج کنور نے اسے شہر لے جا کر ایک میڈیکل کالج میں داخلہ دلوایا ہے دو سال گزر چکے ہیں اور دو سال باقی ہیں اس کے بعد روپ کنور واپس آکر ڈاکٹر بن کر پورے گاؤں کی خدمت کرے گی۔ یہ بات سنتے ہی جمجمانوں اور پنچوں نے آپس میں صلاح مشورے کیے اور آخری فیصلہ سنایا کہ ایک ہفتے کے اندر اس کو تعلیم چھڑوا کر حویلی واپس لایا جائے اور ساتھ دس ہزار روپے جرمانہ بھی ادا کیا جائے۔ عین اسی وقت راج کنور مداخلت کرتی ہے اور پورے جوش کے ساتھ اعلان کرتی ہیں:

> ”اس نرڑیں کو میں نہیں مانتی۔۔۔آپ سب ہوتے کون ہیں ایسے فرمان جاری کرنے والے۔۔۔ہم نے کوئی پاپ نہیں کیا۔ جو ہم ڈنڈ کے ادھیکاری ہوں۔ شکشا پراپت کرنا کوئی جرم نہیں۔ پھر چاہے وہ استری ہو یا پُرُش۔۔۔میں آپ سے پوچھتی ہوں کیا ودھوا استری کوئی جیوت پراٹری نہیں۔۔کیوں ہم اسے گھونٹ گھونٹ کر مار دیتے ہیں۔ سماج کے نیم قاعدے کا وہیں تک پالن ہونا چاہیے جہاں تک وہ مُنشے کی پرگتی میں روکاوٹ نہ بنیں۔۔۔ورنہ انہیں سمے کے ساتھ بدل دینا چاہیے۔“(17)

روپ کنور کی کامیابی کے جشن کی خبر جس طرح گاؤں والوں کو ساری صورتحال سے آگاہ کر کے جمجمانوں اور پنڈتوں کو آگ بگولہ کر دیتی ہے اور اس کے نتیجے میں جب وہ بشن سنگھ کے مردان خانے پر آکر ہلا بول دیتے ہیں اور راج کنور کے اعلان بغاوت پر پورے خاندان پر حملہ آور ہو جاتے ہیں اس سے اس جدید دور میں بھی راجستھانی لوگوں کی توہم پرستی، غلیظ ذہنیت اور جدید دور میں بھی جدت اور شعور سے کوسوں دوری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ راج کنور کی اس جرات پر اس کا اپنا بھائی رتن سنگھ اس کو للکار کر کہتا ہے کہ تم میری بیٹی کے بارے فیصلہ کرنے والی کون ہوتی ہو۔ اس ساری صورتحال کا نتیجہ راج کنور کی صدماتی موت کی صورت میں سامنے آتا ہے اور اس کی موت کے بعد کی رسومات کی ادائیگی کے بعد جس طرح رتن سنگھ رات کو بے ہوشی کی دوا ملا کر بیٹی کو بے ہوشی کی حالت میں

کار میں ڈال کر گاؤں واپس لا کر جمجمانوں کے سامنے پیش کرتا اور پھر حویلی کے اسی کمرے میں قید کر دیتا ہے جہاں وہ پہلے قید رہ چکی تھی راجستھان کے علاقوں میں صدیوں سے انسانی بے رحمی کی کئی داستانوں کی طرح سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے نہ جانے کتنی روپ کنور ماضی میں اس سسٹم کی بھینٹ چڑھ چکی ہوں گی جہاں خواتین کو معاشرہ برابر کے حقوق دینے اور زندگی کے حقوق کا حقدار سمجھنے سے انکاری ہے۔

ناول کا آخری حصہ ناول کی کہانی کو ظلم و ستم کے خلاف روپ کنور کی بغاوت کی صورت میں ایک نیا رخ عطا کرتا ہے۔ روپ کنور واپس آکر قسمت کا لکھا سمجھ کر سب کچھ قبول کر کے خاموشی سے گھر کی صفائی، پانی لانا اور ماضی کو یاد کرنے میں مصروف ہو جاتی ہے لیکن اسے رہ رہ کر خیال آتا کہ کسی طرح واپس لوٹ کر اپنے خواب پورے کر سکے اور ساری رسمیں اور رواج توڑ ڈالے اسی دوران آخر کار ماں کی زبانی روپ کنور پر رونی کی موت اور اپنے باپ کے ہاتھوں جنسی درندگی کے نتیجے میں حاملہ ہونے کا راز کھلتا ہے تو اس پر سکتہ طاری ہو جاتا ہے اور وہ ماں کو تیور دیکھاتے ہوئے کہتی ہے:

> ”ماں یہ گھورانیائے ہے۔آپ سب کورے آدرش وادی بنتے ہو۔۔۔ میں جان گئی ہوں کہ اولاد تک کو جھوٹی شان کے لیے داؤ پر لگانے والے اندر سے کتنے کھوکھلے ہیں۔ بڑے بڑے کانڈ کریں اور شرافت کا سوانگ، اس کلاکاری سے بھریں کہ جیسے ان سے بڑا پرماتما کوئی اور ہو گا ہی نہیں۔ایسے لوگوں کی تو انتر آتما بھی نہیں ہوتی۔۔۔ دھکار ہے مجھ پر جو ایسے ماتا پیتا کے گھر جنم لیا۔۔۔ پر سن لو ماں، میرا تو اب تک تم لوگوں نے جو حال کیا، وہ کیا۔۔ پر اس کیس میں، میں تمہاری طرح چپ بیٹھنے والی نہیں ہوں۔ ایسے ڈھونگیوں کو تو سزا دلوا کر رہوں گی۔“(18)

روپ کنور اپنے باپ کے اس گناہ کا پردہ فاش ہوتے ہی ساری صورتحال کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنے ساتھ روا رکھے جانے والے ظلم و ستم کا موازنہ اپنے باپ کے گناہوں سے کرتی ہے تو اس کو احساس ہوتا ہے کہ یہ لوگ محض جھوٹی شان و شوکت کی خاطر ایسی گناہ آلود زندگی جی رہے ہیں اور وہ اسی لمحے یہ فیصلہ کر لیتی ہے کہ وہ اپنے باپ کو اس کے گناہوں کی سزا دلوا کر رہے گی ساتھ ہی اس کا اظہار وہ اپنی ماں کے سامنے بھی کر دیتی ہے اور اپنی نوکرانی دھونی کے

ہاتھ ایک چٹھی لکھ کر راجکمار کو پہنچواتی ہے کہ یہ چٹھی تھانے پہنچادی جائے۔اور جب چٹھی پاکر پولیس انسپکٹر حویلی آکر کھودائی کرواکر چند کھوپڑیاں اور انسانی بوسیدہ عضاء تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو روپ کنور کی ماں زیوروں کا ایک پوراڈھیر لاکر انسپکٹر کے قدموں میں رکھ دیاالمیہ یہ کہ لالچ فرض پر حاوی ثابت ہوااور انسپکٹر زیورات سمیٹ کر چلتا بنااور روپ کنور تماشا بنے سب کچھ دیکھتی رہ گئی لیکن دھونی کا ہاتھ پکڑ کر وہ اپنا سامان سمیٹ کر حویلی کا گیٹ پھلانگ گئی لیکن کسی کی جرات نہیں ہوتی کہ اس کو روک سکے۔

ناول کا اس انداز میں اختتام قاری کے ذہن پر پیدا ہونے والے سوالات کے سامنے سوالیہ نشان چھوڑ جاتا ہے اور اس کے بعد کیا بیتی ہو گی کیا روپ کنور اس اندھیرے سے نکل کر روشنی کی طرف لوٹنے میں کامیاب ہو پائی ہو گی یا نہیں یہ تجسس باقی رہ جاتا ہے۔ناول کے اسی اختتام کے حوالے سے شہاب ظفر اعظمی رقمطراز ہیں:

> ”ناول کے اختتام پر مصنفہ جلد بازی کا شکار ہو گئی ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ناول کو جلد ختم کر کے قصہ کو نپٹانا چاہتی ہیں۔ قصوروار وں کو سزا کے ساتھ سماج میں تبدیلی اور روپی کے نئے سفر پر قدم بڑھانے کی داستان مزید دلکشی اور تاثیر کا تقاضا کرتی ہے۔اسی طرح اندھیرا پگ کی رسم کے بارے میں قاری کو اشتیاق رہتا ہے کہ یہی ناول کا سرنامہ ہے مگر اس رسم کی ادائیگی کی تفصیل بہت موثر نہیں ہو سکی اسے بہت جذباتی اور دردانگیز واقعہ ہونا چاہیے تھا جو قاری کے دل کو مٹھیوں میں جکڑ لے۔ مگر یہ رسم بہت سرسری انداز میں گزار دی جاتی ہے اور احساس بھی نہیں ہوتا۔“(19)

دراصل ناول نگاری نے پوری کوشش اس جستجو میں صرف کی ہے کہ ناول کو مختصر سے مختصر رکھا جائے اور اسی کوشش میں ناول کے پلاٹ میں کچھ خامیوں کا احساس بھی ہوتا ہے۔

ناول کے کرداروں میں روپ کنور ناول کا مرکزی کردار ہے جو شروع سے آخر تک ناول کی کہانی میں جان ڈالتا رہتا ہے۔وہ ناز نخروں میں پل کر جوانی کی عمر میں قدم رکھتی ہے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ڈاکٹر بن کر سماج کی خدمت کر سکے لیکن رہ رہ کر سماج اس کی راہ میں حائل ہو جاتا ہے اور اس پر اپنی مرضی مسلط کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ تادم آخر مضبوط حوصلوں کے ساتھ سماجی رکاوٹوں کا مقابلہ کرتی اور عمل اور قول سے ان جکڑ بندیوں کو توڑنے کی

کوشش کرتی رہتی ہے جو سماج میں عورت کو اپنی مرضی کی زندگی جینے سے روکنے کے لیے صدیوں سے راجستھانی تہذیب کی فرسودہ رسموں اور رواجوں کا بے دریغ استعمال کرتے ہیں۔

میٹرک کرنے کے بعد اپنی صلاحیتوں کے مطابق اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا اور ڈاکٹر بننا اس کا خواب اور حق تھا لیکن اس کی شادی پرتاب پور کر دی جاتی ہے شادی کے چند ہفتوں بعد بیوہ ہو کر ایک اذیت ناک مرحلے سے گزرتی ہے اندھیرا پگ اور اماؤس کی رات کا انتظار کرتی ہے رسم پوری ہونے میں ڈیڑھ ماہ کا عرصہ اس کی ذہنی و جسمانی حالت کو قابل رحم بنا دیتا ہے۔ حویلی لا کر ودھوا کے لیے بنائے گئے مخصوص کمرے میں قید ہو جانے کے بعد اس کی پھوپھی راج کنور ایک امید کی کرن بن کر نمودار ہوتی ہے اور اسے شہر کی روشنیوں میں خوابوں کی تکمیل کے راستے پر چلانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ وہاں اس کی اعلیٰ تعلیمی کارکردگی سے ڈاکٹر بننے کے خواب حقیقت بننے کے بالکل قریب ہوتے ہیں کہ گاؤں میں اس کی تعلیم کے چرچے عام ہو جاتے ہیں اسی دوران اس کی پھوپھی کی موت سے اس کے حقوق کے لیے اٹھنے والی آخری آواز بھی دم توڑ جاتی ہے۔ اور اس کا باپ رتن سنگھ بے رحمی کی تاریخ کو شرما دینے والی مثال قائم کرتے ہوئے اسے دوبارہ حویلی میں واپس لا کر اندھیری کوٹھڑی کے حوالے کر دیتا ہے لیکن وہ ہمت نہیں ہارتی اور حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہوئے نظر آتی ہے جب رونی کے قتل میں باپ کے ملوث ہونے کا راز افشاں ہوتا ہے تو پولیس کو خبر کر دیتی ہے اور باپ کو سزا دلوانے کے لیے پر عزم ہو جاتی ہے لیکن اس کی ماں اپنے شوہر کو بچانے کے لیے زیورات کا سہارا لے کر پولیس کو منہ بند کر کے واپس لوٹا دیتی ہے تو روپ کنور پھر بھی ہمت نہیں ہارتی اپنا سامان سمیٹ کر حویلی کا گیٹ لانگھ جاتی ہے اور اس کا حویلی سے ان تیوروں سے آراستہ ہو کر پورے عزم کے ساتھ ملازمہ کے ساتھ نکل کر بڑی سڑک پر روانہ ہو جانا مستقبل میں اس کے توانا ارادوں کی نوید سناتا ہے۔

راج کنور کا کردار اس ناول کا ایک اور اہم کردار ہے۔ جو روشن خیال بھی ہے اور پُر عزم بھی شادی شدہ ہے اور اپنے خاوند اور دو بیٹوں کے ساتھ شہر میں زندگی گزار رہی ہے اس کے آنگن میں بیٹی کی کمی ہے اور وہ اس کمی کو اپنی بھتیجی روپ کنور کے ذریعہ پورا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ خود خاندان کی فرسودہ سوچ کا شکار ہو کر اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکی لہذا اپنی بھتیجی کو اعلیٰ تعلیم دلوا کر اس خواب کی تکمیل چاہتی ہے۔ وہ جرات مند بھی ہے اور قوت فیصلہ بھی رکھتی ہے۔ خاندانی عزت و احترام اور تہذیب کی امین بھی ہے اور عبادت گزار بھی لیکن گاؤں کی فرسودہ

رسموں کو توڑ کر گاؤں کے لوگوں کو جدید زندگی اور غربت و پس ماندگی سے نکالنے کا حوصلہ بھی رکھتی ہے اور اس کا عملی مظاہرہ اس کے افکار اور کردار سے بارہا ظاہر بھی ہوتا ہے۔ محمد نصیر احمد اپنے مضمون میں راج کنور کے اس اجلے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''وہ ایک اچھی اور موجودہ دور کی خواتین کی نمائندگی کرتی ہیں۔ وہ ایک روشن خیال خاتون ہیں۔ زندگی کے نشیب و فراز پر اس کی نگاہیں کافی گہری ہیں۔ ان کا کردار اپنی خصوصیت کے اعتبار سے ناول میں انفرادی حیثیت کا مالک ہے۔''(20)

اس روشن خیالی اور جرات کا اظہار کئی مواقعوں پر سامنے آتا ہے۔ سب سے پہلے جب وہ نمایاں طور پر روپ کنور کی مدد کے لیے لپکتی ہے جب وہ اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے شہر لے جانے کی کوشش کرتی ہے لیکن اس کی شادی کر دی جاتی ہے دوسری مرتبہ جب روپ کنور بیوہ ہو کر حویلی میں قابل رحم زندگی گزار رہی ہوتی ہے اور تیسری مرتبہ جب وہ ڈٹ کر جمجمانوں اور پنڈتوں کو روپ کنور کو تعلیم ادھوری چھوڑ کو واپس لا کر حویلی میں دوبارہ اس مایوس زندگی کے حوالے کرنے سے صاف انکار کر دیتی ہے جس کی قید سے وہ بڑی مشکل سے اس کو نکال کر لے گئی تھی۔

اس ناول کا تیسرا اہم کردار روپ کنور کی والدہ سبھدرا کا ہے۔ وہ ایک طرف مامتا کی محبت میں جلتی ہے تو دوسری طرف خاموشی سے اپنی بیٹی پر رسموں رواجوں کے ذریعے ڈھائے جانے والے قہر کے خلاف کوئی مزاحمت نہیں کرتی البتہ خاموشی سے رسموں رواجوں کے برخلاف اپنی بیوہ بیٹی کی دلجوئی کرتی اور ان مصیبتوں سے اسے نکالنے کے لیے ترکیب استعمال میں لا کر اس کی پھوپھی کو ساری صورتحال سے مطلع کر دیتی ہے۔ اور جب اس کی نند روپ کنور کو شہر لے جانے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو اسے سکون کا سانس نصیب ہو جاتا ہے۔ جب وہ اپنے شوہر کو ملازمہ کے ساتھ جنسی ہوس پوری کرتے رنگے ہاتھوں پکڑ لیتی ہے تو وہ خاموش احتجاج کرتے ہوئے اپنے شوہر سے قطع تعلق مشرقیت کا اظہار محسوس ہوتا ہے جہاں عورتیں خاموشی سے مردوں کے ظلم و ستم اور ناانصافیوں کو برداشت کرنے کی عادی ہو چکی ہوتیں ہیں لیکن ان کے اندر ہمدردی کا جو جذبہ پایا جاتا ہے اس کے تحت اپنی ملازمہ رونی کی جان بچانے کے لیے فکر مند رہتیں ہیں لیکن ناکام ہو جاتی ہے اور ناول کے آخر میں بیٹی کی محبت پر شوہر کی محبت اور خاندان کی عزت کو ترجیح دیتے ہوئے انسپکٹر کا دل زیورات میں قید کر کے شوہر کو بچانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ اس سے مشرقی

عورت کی ذہنیت کا پردہ چاک ہوتا ہے جو کہ خاندان کی محبت اور سماج کی پابندیوں میں ذہنی طور پر قید ہو کر احساس کے اصلی اظہار سے محروم ہو جاتی ہیں۔ روپ کنور کی دادی کا کردار ناول کا ایک اور جاندار کردار ہے جس کے ذریعے راجستھان کی خواتین کی ذہنی حالت کا تجزیہ کرنے میں مدد ملتی ہے کہ کس طرح ظلم سہتے سہتے یہ خواتین عورت کے حقوق اور آزادی کے مفہوم سے ناواقف ہو چکی ہوتی ہیں اور جب کسی بیوہ کے حقوق اور بھرپور زندگی کا منظر سامنے آئے تو اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہیں:

> ''کیا ودھوائیں بھی اتنا سکھ بھوگ سکتی ہیں۔ کیا انہیں نیا سنسار رچنے کا ادھیکار دیا جا سکتا ہے؟ نہیں کدا پی نہیں! ہمارے زمانے میں تو۔۔۔!!! اور پھر وہ پلنگ پر دراز ہوئے آنکھیں بند کر لیتیں۔ کچھ دیر کروٹیں بدلتی پھر ٹھنڈی پڑ جاتیں۔''(21)

بعد میں جب روپ کنور کی کامیابی کی خبریں ان کو دی جائیں تو وہ خوش تو ہوتیں لیکن خوف زدہ بھی ہو جاتی کہ جب اگر گاؤں والوں کو روپ کنور کی تعلیم حاصل کرنے کی خبر ملے گی تو فساد کھڑا ہو جائے گا۔ روپ کنور کی تعلیم کا خیال مسلسل ان کے ضمیر کو جھنجھوڑتا رہتا تھا۔ ان کا دوسرا روپ جس میں سفاکی اور بے رحمی کا عنصر صاف ظاہر جھلکتا نظر آتا ہے وہ ہے رونی کے حاملہ ہونے کا معاملہ خاندان کی عزت اس معصوم اور بے گناہ اور اس کے بچے کی زندگی پر حاوی ہو جاتا ہے اور اسے جان سے مارنے پر وہ صاف ظاہر آمادہ نظر آتی ہیں۔ دادی کے کردار کے اسی رویے یہ اظہار خیال کرتے ہوئے اسے ایک علامتی کردار قرار دیتے ہوئے شہاب ظفر اعظمی کہتے ہیں:

> ''دادی کا کردار اس معنی میں علامتی بھی ہے کہ یہ اس نظام کی سختی انسانوں کے دوغلے پن اور اہل خانہ کے فکر و عمل میں تضاد کی طرف اشارے کرتا ہے۔''(22)

دادی کے نظریات میں ایک پوتی کا بیوہ ہو جانا اس کا تعلیم حاصل کرنا اور ایک ملازمہ کا جنسی استحصال کے نتیجے میں حاملہ ہو جانا اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کی سزا موت یا زندگی بھر قیدیوں جیسی زندگی ہے اور دوسری طرف خاندان کے مردوں کی برتری قائم رکھنے کے لیے رتن سنگھ کو اپنے پاپ پر پردہ ڈالنے کے لیے رونی کے قتل کے فیصلے پر عمل درآمد میں بھی کوئی روکاوٹ نہیں ڈالتی ہیں بلکہ جب سبھدرا کی حالت دیکھ کر آخر اس کو بتا دیتی ہیں کہ رتن سنگھ نے ہی اس کو مارا ہے تو ان کے انداز سے ذرا بھی ندامت یا گناہ کا احساس نہیں ہوتا۔

"لہو، پاپ پُنے کیا ہے۔ تم ابھی تک نہیں سمجھیں۔۔۔؟ یہ بھی توریتی رواجوں پر دھرم کی مہروں کے نام ہیں بس۔۔۔اور کچھ نہیں۔۔ پھر کل کی لاج۔۔۔۔ سسرال کی مریادا کا بھی تمہیں دھیان ہے کہ نہیں۔۔۔بس جن بت کی بات ہی کرتی رہتی ہو۔۔"(23)

دادی کی صرف سوچ راجستھان کی تہذیب و ثقافت میں خواتین کی گھٹن زدہ زندگی کی طرف اشارہ کرتی ہے بلکہ وہ سالوں سے اپنی حویلی میں خواتین پر روا رکھے جانے والے ظلم و ستم کی خود بھی ذمہ دار ہیں۔ان کے نزدیک عورت کا حق صرف اتنا ہے کہ وہ مرد کی خوشنودی کا سامان کرتے ہوئے بچے پیدا کرے اور حویلی میں قید رہ کر زندگی گزارے۔

رتن سنگھ اس ناول کا ایک ایسا مرد کردار ہے جو مسلسل ناول کی کہانی پر حرکت میں نظر آتا ہے اس کے اندر اپنی بیٹی کے لیے محبت کا جو جذبہ پایا جاتا ہے وہ خاندانی رسم و رواج اور جھوٹی شان و شوکت کی فکر میں دب جاتا ہے مجبوراً وہ اپنی بیٹی کو شہر میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے اپنی بہن راج کنور کے ساتھ بھیجنے پر رضامند تو ہو جاتا ہے لیکن جیسے ہی گاؤں کے جمجمانوں اور پروہتوں کا دباؤ بڑھتا ہے وہ فوراً اپنے اصلی قہر آلود روپ میں سامنے آجاتا ہے۔

شہاب ظفر اعظمی رتن سنگھ کے کردار کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

"ٹھاکر رتن سنگھ کا کردار نسبتاً زیادہ دیر تک سامنے رہتا ہے مگر رسموں، رواجوں اور روایتی اصولوں سے اتنا بندھا ہوا ہے کہ روپی کی آزادی میں وہ کوئی مدد نہیں کر سکتا۔اسی کی وجہ سے روپی کی جلدی شادی ہوتی ہے اور اسی کی وجہ سے روپی شہر سے واپس لوٹنے پر مجبور ہوتی ہے۔ رتن سنگھ کا کردار اس معاشرے کے دوغلے پن اور دوہرے اصولوں کی علامت بھی ہے جہاں مردوں اور عورتوں کے لیے الگ الگ پیمانے مقرر ہیں۔

جہاں بے قصور عورتوں کو اچھائیں دبانے کے لیے جانور سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور کیا جاتا ہے اور مردوں کو اچھاؤں کی پورتی کے لیے گھر کی ملازماؤں کے ساتھ بلاتکار تک کی اجازت دی جاتی ہے۔" (24)

خواتین تو ذہنی غلامی اور جکڑ بندی کا شکار ہیں ہی، مردوں کے لیے ذہنی غلامی اور فرسودہ رسم و رواج سے نکلنا بھی ابھی تک ممکن نہیں ہو سکا۔ڈاکٹر شارقہ شفتین، رتن سنگھ کے کردار پر تنقید کرتے ہوئے موقف پیش کرتی ہیں:

"اکیسویں صدی میں انسان جو خود اپنے وجود کی شناخت کی کوشش میں لگا ہوا ہے اُس کے چاروں طرف ٹیکنالوجی کے جال بچھے ہوئے ہیں وہاں ایک باپ اپنی بیٹی کو صرف بارہویں کے بعد پڑھانے سے نہ پڑھانے کی اِس کشمکش میں مبتلا ہے آج کے اِس دور میں ایک باپ کی اِس طرح کی سوچ دیکھ کر ذہن میں کئی سوالات اُٹھتے ہیں کہ آخر سماج میں کہاں تبدیلی آئی ہے۔آج بھی بنیادی مسائل اِس طرح دبے اور کچلے ہوئے ہیں اوپر اوپر پھل پھول تو کھل رہے ہیں لیکن جڑ اَب بھی کھوکھلا پڑا ہے۔"(25)

ڈاکٹر شارقہ شفتین کا موقف حقیقت پر مبنی ہے بظاہر میڈیا کی تشہیر سے ہندوستان میں خواتین کی آزادی کا جو ڈھونگ پیٹا جاتا ہے یہ آزادی موجود ہے لیکن صرف شہروں تک اور بڑوں شہروں کے مضافات میں آباد دیہاتوں تک۔ہندوستان کے لاکھوں دیہات جو بڑی آبادیوں سے کوسوں دُور واقع ہیں اور جہاں ملکی اور بین الاقوامی NGOs کی رسائی ناممکن وہاں خواتین اور غریب دیہاتیوں کا کوئی پُرسان حال نہیں ہے۔

راج کمار اس ناول کا ایک اور مرد کردار ہے لیکن یہ کردار بھی سماج کی پابندیوں اور جکڑ بندیوں میں ذہنی طور پر پوری طرح جکڑا ہوا ہے وہ یکطرفہ طور پر روپ کنور سے محبت بھی کرتا ہے اور حویلی کی سخت روایتوں سے ڈرتا بھی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اظہار محبت کرنے سے کتراتا ہے۔لیکن دھونی کے ہاتھ جب روپ کنور اسے ایک چھٹی دے کر تھانے اطلاع کرنے کی درخواست کرتی ہے تو فوراً آمادہ ہو جاتا ہے اور ناول نگار نے ناول دل کی آخری لائنوں میں اسے روپ کنور کے پیچھے پیچھے پکی سڑک پر گامزن ظاہر کیا ہے جس سے قاری کو یہ امید نظر آتی محسوس ہوتی ہے کہ شاید وہ روپ کنور کے شانہ بشانہ اس گاؤں کی قسمت بدلنے میں اپنا کردار ادا کر پائے۔

رونی اور دھونی اس ناول میں رتن سنگھ کی حویلی کے دو اہم خواتین کردار ہیں جو حویلی میں ملازمائیں ہیں ان کا باپ کون تھا اور کس طرح وہ حویلی میں آئیں وہ خود نہیں جانتی البتہ وہ حویلی کی رازدار اور وفاشعار ہیں۔حویلی کی خواتین سے گہری ہمدردی رکھتی ہیں خصوصاً روپ کنور کی قابل رحم حالت سے وہ بھی گہرا اثر لیتی ہیں اور خواتین کی قسمت میں لکھے ان دکھوں پر پریشان ہوتی ہیں۔رونی کا انجام رتن سنگھ کے جنسی استحصال کے نتیجے میں دردناک موت کی

صورت میں ہوتا ہے جب کہ دھونی روپ کنور کی بھرپور مدد کرتی ہے اور کہانی کے آخر میں روپ کنور کی ہمسفر نظر آتی ہے۔

پریم سنگھ رتن سنگھ کا بیٹا ہے لیکن اس کے کردار میں کوئی خاص پہلو نظر نہیں آتا سوائے اس کے کہ شہر میں تعلیم حاصل کر کے وہ ڈاکٹر بننے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے جب اس کی بہن اسے ڈاکٹر بن کر گاؤں کی فری خدمت کرنے کی اپنی خواہش کا اظہار کرتی ہے تو وہ فوراً انکار کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ خاندان کی حالت اچھی نہیں وہ پیسہ کما کر خاندان کی زندگی کو آسان بنانے کی کوشش کرے گا۔

سکھی رام ایک بوڑھے حلوائی کا کردار ہے جو بشن سنگھ کی عمر کا ہے اور حویلی میں روزانہ صبح سویرے جلیبیاں پہنچاتا ہے اور بشن سنگھ سے گہری دوستی رکھتا ہے۔

بشن سنگھ ایک بوڑھے پروہت ہیں جو کریام کرم اور منتر و نتر کرتے کرتے ساری زندگی گزار چکے ہیں اور اب آرام کرتے ہیں اور اپنا خاندانی کام یعنی کریا کرم اور منتر و نتر اپنے سب سے بڑے بیٹے یعنی رتن سنگھ کو سونپ چکے ہیں۔ان کے علاوہ ناول میں کچھ ذیلی کردار بھی سامنے آتے ہیں جن میں روپ کنور کی گاؤں کی سہیلی رضیا، روپ کی کالج کی سہیلی کُسم اور راج کنور کے شوہر دیوندر سنگھ کا کردار بھی شامل ہے اس کے علاوہ روپشور سنگھ کا کردار ایک ایسے شخص کا کردار ہے جو نوجوانی میں گاؤں کا سب سے طاقتور مرد ہونے کی وجہ سے سانڈ قرار پایا تھا اور بہت سی اولاد شادی شدہ لڑکیوں سے ہمبستری کرنے کے نتیجے میں Hiv positive ہو چکا تھا اور تنہائی کی زندگی گزار رہا تھا۔

اس ناول کو ثروت خان نے راجستھانی تہذیب و ثقافت کے تناظر میں لکھا ہے مناظر فطرت ہوں، راجستھانی لباس، روایات، رسومات، عبادات، طرز زندگی، رہن سہن، معاشرت، معیشت غرض بہت سے زاویوں سے راجستھانی تہذیب و ثقافت سے واقفیت ہوتی ہے اور قاری راجستھانی سرزمین کی پراسراریت اور ہمہ ہمی میں متفکر ہو کر گہری سوچ میں مبتلا ہو جاتا ہے لیکن ناول نگار دراصل تہذیب و ثقافت کا بیان بطور حوالہ پیش کرنا چاہتی ہیں اور یہ بھی چاہتی ہیں کہ قاری کی فکر تہذیب و ثقافت کے چکا چوند نظاروں میں محسور ہو جانے کی بجائے سماجی مسائل کی طرف برقرار رہے یعنی ناول میں تہذیبی و ثقافتی رنگ میں رنگے سماجی مسائل راجستھانی تہذیب و ثقافت کی پیچیدہ تہوں کو بتدریج کھولتے چلے جاتے ہیں ثقافتی اظہار کے ساتھ ساتھ ناول میں ثروت خان کا اردو اور ہندی کے علاوہ

راجستھانی زبان پر عبور بھی صاف دکھائی دیتا ہے۔ راجستھانی زبان کے الفاظ و جملے ثروت خان کے مرکزی نقطہ نظر کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

"یہ ناول بڑا کینوس رکھتا ہے جس میں راجستھانی کی پوری ثقافت، رہن سہن، طور طریقے، فرسودہ نظام، دہرا کردار عورتوں کے حالات ابھر کر سامنے آئے ہیں۔"(26)

ثروت خان نے نہ صرف یہ کہ راجستھانی کلچر اور مسائل کو اُجاگر کیا ہے بلکہ انہوں نے اُردو، ہندی اور راجستھانی زبان کے استعمال سے تخلیقی خوبیوں کا بہترین مظاہرہ بھی کیا ہے۔ منظر نگاری کے بہت عمدہ نمونے بھی پیش کیے ہیں۔ محاوروں کا استعمال نہایت خوبصورتی سے کیا ہے۔ راجستھان کی ثقافت دِلکش بھی ہے اور عجیب بھی اور ثروت خان نے جو ثقافتی جھلکیاں پیش کی ہیں وہ قاری کے ذہن کو اپنی جانب راغب کرتی ہیں۔

حوالہ جات

1۔ محمد نصیر احمد، ناول "اندھیرا پگ" ایک اجمالی جائزہ، مشمولہ: ساغرِ ادب، (مظفر پور۔انڈیا: جولائی تا ستمبر 2021ء)، ص69

2۔ شہاب ظفر اعظمیٰ، ثروت خان کا ناول "اندھیر پگ" ایک مطالعہ، مشمولہ: مباحثہ، (پٹنہ: جنوری تا مارچ 2007ء)، جلد4، شمارہ27، ص85

3۔ ثروت خان، اندھیرا پگ، (دہلی: معیار پبلی کیشنز، 2005ء)، ص9

4۔ ایضاً، ص10

5۔ ایضاً، ص12

6۔ ایضاً، ص14

7۔ ایضاً، ص14

8۔ ایضاً، ص19

9۔ ایضاً، ص20

10۔ ایضاً، ص23

11۔ ایضاً، ص32

12۔ ایضاً،ص39
13۔ ایضاً،ص63
14۔ ایضاً،ص74
15۔ ایضاً،ص79
16۔ ایضاً،ص78
17۔ ایضاً،ص116
18۔ ایضاً،ص134
19۔ شہاب ظفر اعظمی،مباحثہ،(پٹنہ:ماہر پرنٹرس اینڈ کمپوزرس،2007ء)،ص86
20۔ محمد نصیر احمد،بحوالہ:اردو ناول کی پیش رفت از ڈاکٹر منصور خوشتر،(دربھنگا۔انڈیا،المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ،2017ء)،ص411
21۔ ثروت خان،اندھیرا پگ،ص79
22۔ شہاب ظفر اعظمی،مباحثہ،ص82
23۔ ثروت خان،اندھیرا پگ،ص81
24۔ اعظمی،شہاب ظفر،مباحثہ،ص82
25۔ شارقہ شفقین،ثروت خان اور اندھیرا پگ،مشمولہ:اذکار،(بنگلور:کرناٹک اُردو اکادمی،جنوری فروری مارچ 2014ء)،شمارہ26،ص68
26۔ احمد صغیر،اردو ناول کا تنقیدی جائزہ(1980ء کے بعد)،(دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2015ء)، ص285